ایمان افروز اور سبق آموز کہانیوں کا سلسلہ

آستین کے سانپ

کہانی نمبر 11

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

عزام محسن

اساس انسٹیٹیوٹ

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام مجموعہ:	آستین کے سانپ
نام کہانی:	جو چلے تو جاں سے گزر گئے
مصنف:	عزام محسن
تعداد:	ایک ہزار
تاریخ:	جنوری 2024
زیر انتظام:	اساس انسٹیٹیوٹ
پبلشر:	اردو سرائے
رابطہ نمبر:	محمد عبداللہ 0334-9363518

دل کی بات

قدرت نے انسان کے سامنے دو راستے رکھے ہیں۔ایک حق اور دوسرا باطل...ایک سچ اور دوسرا جھوٹ...ایک صحیح اور دوسرا غلط...اس وقت دنیا میں جتنی بھی نظریاتی محنت ہو رہی ہے ،اس میں ہر کوئی اپنے آپ کو حق اور سچ کا دعویدار کہتے ہوئے دوسرے کو غلط اور جھوٹ ثابت کر رہا ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی کتاب،قرآن مجید فرقانِ حمید میں حق اور باطل کی نشانیاں واضح کی ہیں ۔حق والوں کا راستہ بھی بتایا ہے اور باطل کی ریشہ دوانیوں سے بھی پردہ چاک کیا ہے۔باطل نے حق کا راستہ روکنے کے لیے کبھی علی الاعلان اُسے للکارا ہے اور کبھی حق کا جعلی روپ دھار کر بہروپیے کی شکل اختیار کی اور حق والوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔اس ساری محنت کے پیچھے نسلِ آدم کا ازلی دشمن ابلیس ہی ہے۔

ابلیس جب سے راندہِ درگاہ ہوا،تب سے ہی انسان کو گمراہ کرنے پر لگا ہوا ہے۔ایسی صورتِ حال میں انسان کے لیے درست راستے کا انتخاب ضروری اور لازم ہو جاتا ہے۔ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ دراصل خاتم النبیین ہیں۔ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی اپنی نبوت کے ساتھ نہیں آئے گا،مگر قدرت کے اس فیصلے سے بغاوت کرنے والے کئی شیطان کے ہرکارے میدان میں آئے،اپنا اپنا منجن بیچا،عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔انہیں میں ایک نام مرزا غلام احمد قادیانی کا ہے جس نے خود کو یسوع مسیح کہتے ہوئے نبوت جیسے عظیم مرتبے کی توہین کی۔

مرزے کی سوچ دراصل ہندوستان میں انگریز سرکار کی طے شدہ پالیسی کا تسلسل تھی۔قیامِ پاکستان کے بعد مرزے کے بدبخت پیروکاروں نے اس نئے اسلامی ملک میں اپنے پنجے گاڑنے

شروع کر دیے۔ مگر فدایانِ ختم نبوت کی بیش بہا قربانیوں کی بدولت حکومتِ پاکستان کو انھیں غیر مسلم اور کافر قرار دینا پڑا اور اب ان کا کفر آئینِ پاکستان کا حصہ ہے۔ مگر اس کے باوجود قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھے مسلمانوں کو بہکانے میں مصروف ہیں۔ اسی سلسلے میں ادارہ ''اساس'' نے بھرپور انداز میں جواب دیتے ہوئے اہلِ اسلام کو ان کی چالوں سے خبردار کیا ہے۔

قادیانیت کے مکروہ چہرے سے نقاب اتارتے ایسے واقعات، ایسی کہانیاں جو روز کہیں نہ کہیں وقوع پذیر ہوتی ہیں، ادارہ اساس نے انھیں جمع کر کے نئے اسلوب کے ساتھ ''آستین کے سانپ'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ کہانیاں مختلف ذیلی عنوانات کے ساتھ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ انھیں خود بھی پڑھیے اور دوسرے مسلمانوں تک پہچانے میں ہمارے معاون بھی بنیے۔

اساس انسٹیٹیوٹ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

شہر کی یہ مشہور اور معروف سڑک رات کے اندھیرے میں کافی ویران تھی۔ کوئی بندہ بشر اس وقت یہاں موجود نہ تھا، ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ کبھی کبھار کوئی پہریدار اس سڑک پر سیٹی بجاتا ہوا گزر جاتا تھا۔اچانک رات کے آخری پہر میں ایک سایہ اس سڑک پر نمودار ہوا۔ یہ سایہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک پرانی سی عمارت کیسامنے جا کر رُکا۔

کچھ دیر بعد یہ سایہ ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ کر سامنے والی عمارت کو بغور دیکھنے لگا۔اس سے پہلے کہ اس پر کسی کی نظر پڑتی، وہ سر پر چادر ڈال کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ یہ ہیولا ایک نوجوان کا تھا اور وہ گزشتہ دو دن سے اسی عمارت کی ریکی کر رہا تھا۔

اس نوجوان کو اپنے ساتھیوں کے ذریعے اس عمارت میں کچھ غیر معمولی سر گرمیوں کی اطلاع ملی تھی۔ وہ انہی سر گرمیوں کا راز جاننے کے لیے رات کے اس پہر گھر سے نکلا تھا۔آج اُسے یہ کام کرتے ہوئے تیسرا دن تھا۔اچانک وہاں ایک پانی جیپ آکر رکی۔

''اوہ! اس گاڑی میں کون ہو سکتا ہے؟'' اُس نے سوچا۔

''شاید کوئی غنڈے ہوں۔'' اُسے ایک خیال آیا ہی تھا کہ وہ خیال فوراً جھٹکنا پڑا۔

''ارے! اس میں سے تو عورتیں نکل رہی ہیں۔''اس نے اندھیرے میں گاڑی کو غور سے دیکھا تھا۔

اب اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا، وہ ایک دیوار کے ساتھ لگ کر یہ منظر دیکھنے لگا۔ جیپ سے کچھ خواتین اور بچوں کو اُتارا گیا تھا، اس کے ساتھ ہی عمارت کا دروازہ کھلا اور دو آدمی خواتین اور بچوں کو لے کر عمارت کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی مخصوص اور مشکوک سرگرمیوں کا اُسے پہلے شک تھا، مگر اب اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ اب جلدی سے واپس جانا چاہتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ یہ کام کرتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا ہو گا، مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ جیسے ہی وہ عمارت کے دروازے سے آگے بڑھا، اچانک اس کے پیچھے ایک اور سایہ اس کا تعاقب کرنے لگا۔ اس نے کئی بار رُک کر جائزہ لینے کی کوشش کی مگر ہر بار تعاقب کرنے والا سایہ مہارت سے کہیں چھپ جاتا۔ وہ نوجوان کسی کو مزید شک کا فائدہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے دائیں بائیں دیکھ کر اُس نے ناک کی سیدھ میں تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنا تعاقب کرنے والے سائے سے کوئی خوف تھا، بلکہ اس مشن کی راہ میں جان دینا اس کے لیے فخر کی بات تھی، البتہ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ موت سے قبل اس کا مشن مکمل ہو جائے، ابھی وہ اسی بارے میں سوچتا ہوا اندھیرے میں تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ یہ گولیاں کسی اونچائی سے اُس پر برسائی جا رہی تھیں۔ کئی سنسناتی ہوئی گولیاں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں، وہ اپنے بچاؤ کے لیے تھوڑا جھکا اور پھر دیوار کے ساتھ زمین پر لیٹتا چلا گیا۔

دس منٹ بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ کرالنگ کرتا ہوا آگے کو رینگنے لگا، اندھیرے میں اسے دیکھنا مشکل تھا، مگر دشمن کا پھر بھی کوئی اعتبار نہ تھا۔ کچھ فاصلہ کرالنگ کے ذریعے طے کر کے وہ جیسے ہی زمین سے تھوڑا اوپر رکوع کے انداز میں جھکا، اگلے ہی لمحے ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کی ٹانگ میں آ لگی۔ خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ مگر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا، لنگڑاتا ہوا وہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

گولیاں مارنے والوں نے کچھ دیر اس کا تعاقب کیا، پر اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ یہ باریش نوجوان خون میں لت پت بھاگتا دوڑتا ایک تنگ گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے اپنی سانسیں بحال کیں اور پھر دوبارہ منزل کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ اپنی مرہم پٹی کرنے کے ساتھ ساتھ آج کے واقعہ کی اطلاع بھی اپنے ساتھیوں کو دینا چاہتا تھا۔

....☆....

''سانپ آگیا رے سانپ.... بھاگو...''

جمال بابا کے ڈیرے پر اچانک ایک شور بلند ہوا اور ہر طرف سانپ سانپ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ آس پاس کھڑے لوگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی، کوئی ادھر کو بھاگ رہا تھا تو کوئی اُدھر۔ ایک موٹا اور لمبا سانپ زمین پر رینگتا ہوا چھپنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک سانپ اِدھر اُدھر رینگنے کے بعد کماد کی فصل میں جا گھسا۔

''ایسے خطرناک سانپ ڈس لیں، تو بندہ پانی بھی نہیں مانگتا۔'' افضل چاچا نے کہا۔

''تو اور کیا... بڑے بڑوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔'' انور نے بات آگے بڑھائی۔

''جیسے ابھی آپ سب لوگوں کی سٹی گم گئی ناں!''

نور الدین نے ہنستے ہوئے کہا، اس سے پہلے کہ اسے کوئی آدمی جواب دیتا، اچانک ایک دھان پان سا نوجوان کماد کی فصل کی جانب لپکا۔

''ارے! کدھر جا رہے ہو؟ مرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

افضل چاچا نے آواز لگائی، مگر وہ نوجوان سنی ان سنی کر کے کماد کی فصل میں سانپ کا تعاقب کرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک ڈنڈا تھا۔ اس بہادری پر لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نوجوان سانپ کا تعاقب کرتا ہوا کماد کی فصل میں بہت آگے تک جا چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ لوگ اس نوجوان کو باہر نکالنے کی کوشش کرتے، اچانک کماد کی فصل میں ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ ہی چیخیں بھی بلند ہوئیں۔ باہر کھڑے لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ جب کچھ منٹوں تک نوجوان واپس نہ آیا، تو ڈیرے دار بابا جمال نے قریب کھڑے لوگوں پر ایک

طائرانہ نگاہ ڈالی اور کہنے لگا:

''کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ کماد کی فصل میں جو نوجوان گیا، اُسے تلاش کرو، کس کا بیٹا تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟''

پیچھے سے ایک آواز آئی:

''بھارفیق کا پُتر ہے جی وہ...اور اظہر نام ہے اُس کا۔''

''بالکل! وہ لڑکا ایسا ہی ہے، نڈر اور بے باک سا۔''

چودھری انور نے تصدیق کی۔ اب دو چار بندے اظہر کو آوازیں دیتے ہوئے کماد کی فصل میں جا گھسے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے کہ کہیں ان کا سانپ سے ٹاکرا نہ ہو جائے۔ اچانک ہلکی سی سرسراہٹ کی ہوئی۔ ڈر کے مارے کچھ باہر بھاگے، مگر پھر لوگوں نے ایک اور ہی منظر دیکھا کہ اظہر ایک لمبی سی چھڑی کے اوپر مردہ سانپ کا وجود لٹکائے باہر آرہا ہے۔

لوگوں نے اسے دیکھتے ہی بلند آواز میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔ خطرناک سانپ کو تن تنہا مارنے کا کارنامہ سرانجام دینے پر نوجوانوں نے اظہر کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا تھا۔ حال ہی میں میٹرک کا امتحان دینے والے نوجوان اظہر کی بہادری پر لوگ اُسے خوب داد دے رہے تھے۔ پورے گاؤں میں اُسی کا چرچا تھا۔ اہل گاؤں اب اسے ایک بہادر کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔

....☆....

شہر کی اس مشہور سڑک پر جب صبح لوگوں کا گزر ہوا تو انھیں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا، گلی میں جگہ جگہ گولیوں کے خول اور خون کے قطرے بکھرے پڑے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

''سنا ہے یہاں رات کو فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔'' ایک آدمی نے پوچھا۔

''ہاں بھائی! میں نے خود فائرنگ کی آواز سنی ہے۔ رات تین بجے کا وقت تھا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''مگر کس غریب کی شامت آئی ہو گی؟''

''کیا پتا کسی نے ہوائی فائرنگ کی ہو؟''

''اچھا! اگر ہوائی فائرنگ تھی تو یہ خون کس کا ہے پھر؟''

''ہاں یار! پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ خون کسی جانور کا ہو؟''

جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق لوگ چہ مگوئیوں میں مگن تھے۔ قریبی مارکیٹ والے 15 پر کال کر کے پولیس کو اطلاع دے چکے تھے۔ پولیس کی وین وقوعہ پر پہنچی تو انھوں نے مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے واقعہ کی انکوائری شروع کر دی۔

سڑک کے کنارے خون کی خشک لکیریں واضح کر رہی تھیں کہ زخمی ہونے والا آدمی کس جانب گیا ہے۔ ایسے میں مارکیٹ کمیٹی کی صدر حاجی ابرار شاہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا کہ مارکیٹ میں ہونے والا واقعہ تشویش ناک ہے۔ اس کی ضرور جانچ ہونی چاہیے۔

''یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے کسی چور ڈاکو نے راہ چلتے فائرنگ کر کے کسی کو قتل یا زخمی کر دیا ہو۔''

ایک اور دکاندار نے خدشے کا اظہار کیا۔

اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے سوالات اُٹھ رہے تھے، پولیس سمیت کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ گولیاں کہاں سے آئیں اور زخمی ہونے والا کون تھا۔ پولیس نے ''نامعلوم افراد'' کے خلاف تحقیقات کے لیے اپنی ضروری کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔

ارد گرد کے کئی لوگ اسے اتفاقی واقعہ یا حادثہ سمجھ کر اپنے کاموں میں مگن ہو گئے۔ آج تک حالی روڈ پر موجود اس پُراسرار عمارت کا راز فاش ہونے سے ابھی تک بچا ہوا تھا۔ آخر اس عمارت میں ایسی کیا چیز ہے؟ اب لوگوں کو بھی تجسس ہونے لگا تھا۔

....☆....

اظہر میٹرک کے امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور آگے پڑھنے یا نہ پڑھنے کے بارے میں ابھی تذبذب کا شکار تھا۔ اس کا دل تھا کہ وہ آگے کوئی ہنر سیکھ کر یا تعلیم حاصل کر کے اپنے ماں باپ کو کچھ راحت پہنچائے۔ دسویں جماعت کا رزلٹ آیا، تو اِس نے بہت عمدہ نمبروں کے ساتھ میٹرک کا

امتحان پاس کر لیا تھا۔ یہ 1982ء کا سال اور مئی کا مہینہ تھا۔

اظہر کے اتنے شاندار نمبر دیکھ کر گاؤں کے نمبر دار نے اُسے والدین سمیت کو اپنے ڈیرے پر مدعو کیا۔ گاؤں کے دیگر بڑے زعماء کے سامنے نمبر دار صاحب نے اعلان کیا کہ اظہر ہمارے گاؤں کا اثاثہ ہے۔

''بھئی دوستو! ہم تو اظہر پتر کو اپنے خرچے پر شہر کے کالج میں داخل کروائیں گے۔''

نمبر دار صاحب نے کہا تو دوسرے لوگوں نے ان کے اس جذبے کو خوب سراہا۔ اظہر کے غریب والد رفیق نے نمبر دار صاحب کی اس تجویز پر بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

''دیکھنا یہ ایک دن گاؤں کا نام روشن کرے گا۔'' نمبر دار صاحب نے دوبارہ کہا۔

''کیوں بھئی! تیار ہو ناں اظہر پتر؟''

چودھری انور نے اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے پوچھا تو اظہر نے کچھ شرماتے ہوئے اپنے عزم کا اظہار کر دیا۔

یوں پھر اظہر نے گاؤں سے اُٹھ کر شہر ساہیوال کے ٹیکنکل کالج میں داخلہ لے لیا۔

یہاں بھی اس کی تعلیمی کارکردگی بہت عمدہ رہی۔ علم کے ساتھ ساتھ اس نے فنون بھی سیکھے۔ اس کا مادر علمی انڈسٹریل ایجوکیشن اور فنی تعلیم کا علاقے میں سب سے بڑا ادارہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ اور گاؤں کے لیے کچھ کرنے کا عزم لیے ہوئے تھا۔

اب ہاسٹل میں رہتے ہوئے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ پہلے دو سال کا نتیجہ دیکھ کر لگتا تھا کہ اظہر کی خوب محنت اور تعلیمی کارکردگی کی بنیاد پر اِسے لاہور کی سرکاری انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا۔ ساہیوال میں اظہر نے شام کے وقت تھوڑا بہت کام کاج بھی شروع کر دیا تھا۔ اس سے اُس کے مالی اخراجات میں آسانی ہو جاتی تھی۔

بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ کمائی کرتا دیکھ کر بھاء رفیق کے من میں بھی وہی خواہش جاگی، جو اکثر والدین کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ یعنی کہ بیٹے کے لیے ایک اچھا رشتہ تلاش کیا جائے

لگا تھا۔ اظہر کو جب اس بارے بتایا گیا تو وہ سعادت مند اولاد کی طرح ذرا شرما گیا۔ لیکن اس کے دل میں کیا خواہش تھی، شاید کوئی نہیں جانتا تھا۔

''اُس گلنار کا کیا ہو گا پھر؟''

''کیا میری شادی مومنہ کے بجائے کسی اور سے ہو جائے گی؟''

کئی طرح کی سوچیں اس کے دماغ میں گردش کرنے لگیں۔

دراصل کچھ ماہ قبل اظہر کے ہاں اس کی خالہ اپنی بیٹی کے ہمراہ آئی تھی۔ اظہر نے اپنی خالہ زاد مومنہ کو کئی سال بعد ایک نظر دیکھا، تو حیران رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ چھوٹی سی ہوتی تھی۔

بس اس کے دن کے بعد مومنہ اظہر کے دل میں کہیں نہ کہیں جگہ بنا چکی تھی۔ پر شرافت کے ہاتھوں مجبور اس نے کسی سے اس بات کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ اب جیسے ہی اس کے والد نے اس کے رشتے کی بات چھیڑی تو اس کے دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی، کیوں کہ اس کے ماں باپ کہیں اور اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہے تھے۔ بہر حال ایک نیک پارسا اولاد کی طرح اس نے بھی والدین کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھا اور مومنہ کا خیال دل سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔

آج بروز جمعرات وہ کئی ہفتوں کے بعد گھر لوٹا تھا۔ کچھ بجھا بجھا اور تھکا ہارا سا۔ اُسے معلوم تھا کہ میرے ماں باپ میرے لیے کوئی لڑکی تلاش کر چکے ہوں گے۔ واقعی اس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ اس کے والدین نا صرف اس کے لیے لڑکی تلاش کر چکے تھے بلکہ لڑکی والوں کو زبان بھی دے چکے تھے۔ بجھے دل کے ساتھ اس نے یہ خبر سنی۔ مگر ایک بار بھی لڑکی بارے پوچھنا گوارا نہ کیا۔

''اظہر پتر! تُو نے پوچھا تک نہیں کہ لڑکی کون ہے اور کیا کرتی ہے؟'' ماں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''ماں! بھلا تیری پسند کو میں ٹھکرا سکتا ہوں، جو بھی ہو گی، تُو نے بہتر ہی دیکھی ہو گی۔'' اظہر پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔

''مومنہ ہے... تیری ماسی کی دھی رانی.... مومنہ.... وہی ہو گی تیری دلہن!'' ماں نے کہا تو اظہر ایک دم اچھل پڑا۔

"کک.... کیا....!!!... کیا واقعی؟"

اس حالت ایسی تھی کہ چند سال کا بچہ کھلونا ملنے پہ خوش ہو رہا ہو۔ ماں اس کی یہ حالت دیکھ کر کافی دیر ہنستی رہی، باپ نے بھی مسکراتے ہوئے اسے کندھے پر تھپکی دے کر گلے لگا لیا تھا۔

....☆....

حالی روڈ پر موجود اس عمارت میں ایسا کیا تھا؟ آخر ایک عام سی عبادت گاہ ہی تو تھی۔ جہاں بالکل مسلمانوں کی طرز پر نماز ادا کی جاتی، اذان بھی ہوتی تھی۔ جس کے در و بام پر اسلامی نقوش کنداں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ اس عبادت گاہ کے لیے جگہ 1942ء میں معروف ہندوستانی تنظیم انجمنِ اسلام نے مقامی "مسلمانوں" کو فراہم کی تھی۔

آج اکتوبر 1984ء میں بھی یہ عمارت موجود تھی۔ اسی عبادت گاہ پر اسلامی طرز کے تمام کلمات اور مینار موجود تھے۔ قریب ہی بہت بڑی مارکیٹ اور ایک عدد بڑا پرائیویٹ اسپتال تھا۔ یہاں علاج کی غرض سے آنے والے مریضوں کے لواحقین نماز اور عبادت کے لیے اسی عبادت گاہ کا رخ کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل مقامی لوگوں کو اس عمارت اور یہاں کی سرگرمیوں پر اعتراض ہوا تھا۔ یہ اعتراض بالکل جائز بھی تھا۔ کیوں کہ یہاں آئے روز پُراِسرار سرگرمیاں منعقد ہوتیں، مگر انتظامیہ نے کبھی عوام کی بات کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔

شہر کا ڈپٹی کمشنر اور ضلعی پولیس آفیسر اس شکایت کو سرے سے ہی ناقابل عمل سمجھتے، بلکہ وہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق شکایت کرنے والوں پر انتہا پسندی، مسلک پرستی اور نہ جانے کیا کیا الزامات لگا کر اپنے تئیں معاملہ ہی ختم کر دیا جاتا تھا۔

اس عبادت گاہ کے متولین کا چال چلن کچھ مشکوک سا تھا۔ رفتہ رفتہ اُن پر یہ شبہات مزید بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ انہی سرگرمیوں پر مقامی لوگوں نے کئی بار شکایت کی، مگر کہیں بھی ان کی بھی شنوائی نہ ہوئی۔ اب لوگوں نے علماء کرام اور مذہبی جماعتوں کو اس معاملے میں شامل کر لیا تھا۔ تمام تر تحقیق کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس عبادت گاہ کو قانونی طریقے سے بند کروایا جائے۔

مگر اس مہم کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ایک بڑے دینی مدرسے کے مہتمم تک یہ بات پہنچی، تو انھوں نے برائی کے خاتمے اور اللہ کی رضا کے لیے اس مشن کی ذمہ داری قبول کرلی۔ قانون کو اس عبادت گاہ میں کسی بھی قسم کی پُراسرار سرگرمیوں کے ثبوت درکار تھے۔ یہاں تک سننے میں آیا تھا کہ عبادت گاہ کے متولین نے کئی سادہ لوح، غریب مسلمان عورتوں اور بچوں کو ورغلا کر، انھیں پیسے کا لالچ دیکر اپنے ہاں محبوس کر رکھا تھا۔

وہ ان سادہ لوح لوگوں کے دینی نظریات کو اپنے سانچے میں ڈالنا چاہتے تھے۔ مگر قانون میں ایسا کوئی بھی کام ان کے لیے جرم کے مترادف تھا، اس لیے وہ طبقہ یہ کام رات کو چوری چھپے کرتا تھا۔

مدرسے کے مولانا صاحب نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ ثبوت جمع کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ ان کے کچھ شاگردوں نے آپس کی مشاورت بعد اس کام کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا۔ چار طلبا جنھوں نے اس مشن کے لیے خود کو پیش کیا تھا، ان میں ایک برہان بھی تھا۔ یہ تمام نوجوان جاسوسی کے ذریعے عبادت گاہ کے اندر اور ارد گرد کے معاملات جاننا چاہتے تھے کہ یہاں قانون کے خلاف کون کون سا کام جاری ہے۔

آج رات عبادت گاہ کے دروازے تک جانے کی باری برہان کی تھی، جو اس اندھیری رات کے آخری پہر میں عمارت کے عین قریب جا پہنچا، مگر شک پڑنے پر سیدھا آگے کو نکل گیا تھا اور اب بوقتِ سحر گولیوں سے چھلنی برہان بھاگتا دوڑتا ایک محفوظ ٹھکانے تک پہنچ چکا تھا۔

....☆....

لڑکی بہت خوبصورت، سعادت منداور پڑھی لکھی تھی۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ اس نے قرآن پاک بھی حفظ کر رکھا تھا۔ مومنہ میں یہ تمام خوبیاں ہی اظہر کے والدین کو اس کی طرف کھینچ کر لے گئی تھیں۔ رشتہ طے پا گیا۔ البتہ لڑکی نے ایک انوکھی شرط یہ رکھ دی تھی کہ نکاح تب ہو گا جب اس کا ہونے والا شوہر قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر کسی اچھے استاد سے پڑھ لے گا۔

یہ معصوم اور مفید شرط بھلا کسے منظور نہ ہوتی۔ چناں چہ اظہر نے دل ہی دل میں اس معصوم خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا۔ مسکراتے اور شرماتے ہوئے اس نے نا صرف ترجمہ و تفسیر والی شرط بھی قبول کر لی، بلکہ اب اُس نے اپنا ناظرہ قرآن مجید درست تلفظ کے ساتھ دہرائی کرنے کی بھی ٹھان لی تھی۔

اس بار جب وہ کالج پہنچا تو بہت پُر جوش تھا۔ دوپہر کی کلاسز سے فارغ ہو کر اس نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور تانگے پر بیٹھ کر ایک دینی مدرسے کا رخ کر لیا۔ یہ شہر کا بہت بڑا اور قدیم دینی مدرسہ تھا۔ اس درس گاہ سے سینکڑوں شیوخ اور علماء سند فراغت پا چکے تھے۔ اظہر نے مدرسے میں پہنچ کر اپنی عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُسے حیرت انگیز طور پر تہہ دل سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔

''یہ شوق تمھیں کیوں کر پیدا ہوا؟'' اظہر سے سوال کیا گیا، اس نے شرماتے ہوئے تفصیل سے بتایا تو سبھی مسکرا دیے۔

مدرسے میں قاری بشیر احمد اُس کے تفسیر کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ وہ انتہائی مشفق اور صاحبِ علم شخصیت تھے۔ سب سے پہلے قاری بشیر صاحب نے اظہر کو اس عظیم مقصد میں قبولیت پر مبارک باد دی۔ پھر بسم اللہ پڑھ کر پہلا سبق دے دیا۔ اب وہ روزانہ شام کو دو گھنٹے کے لیے مدرسے آتا اور قرآن پاک کے ترجمے اور تفسیر کے علم سے خود کو سیراب کرتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔

ایک دن حسبِ معمول اظہر مدرسے پہنچا تو قاری صاحب گیٹ پر ہی مل گئے، وہ کچھ مصروف اور پریشان دکھائی دے رہے تھے، اچانک اظہر نے قاری صاحب کا لباس دیکھا تو چلا اُٹھا:

''اوہ! قاری صاحب! یہ خون کیسا؟''

''بتاتا ہوں، پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارا بلڈ گروپ کیا ہے؟ ہمیں جلد بی پازیٹو بلڈ چاہیے۔'' قاری صاحب نے بتایا۔

''اللہ کریم...'' اس کے منہ سے ایک دم نکلا.... ''خیر تو ہے ناں قاری صاحب!''

''ہاں بالکل! اب الحمدللہ خیر ہی ہو گی۔'' قاری صاحب نے کہا اور اسے اندر کمرے میں جانے کا اشارہ کر دیا۔

جیسے اظہر اندر پہنچا، تو ایک زخمی نوجوان کو سوتا ہوا دیکھ کر گھبرا گیا، پھر وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔

''قاری صاحب! یہ صاحب کون ہیں؟ اور کیا ہوا ہے؟'' اظہر بے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہ برہان ہے.... میرا شاگردِ خاص... آج ایک مہم پر گیا تھا۔ بس وہیں اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔''

قاری صاحب نے تفصیل بیان کی۔

''کیسی مہم قاری صاحب؟ کیا یہ شکار پر گیا تھا؟''

''ہاں! یہی سمجھ لو.... مگر ابھی تم اس سے کچھ نہ پوچھنا۔''

قاری صاحب نے وضاحت کی اور اظہر کو پڑھانے لگے۔ مگر آج دونوں کا دل سبق سے زیادہ دوسری باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آج کا سبق ختم ہوا تو اظہر ضروری نوٹس تیار کرنے لگا۔ اس دوران اس کی ساری توجہ زخمی نوجوان کی طرف تھی۔ پھر ذرا ہمت کر کے قاری صاحب کے قریب آیا اور کچھ ٹھہرتے ہوئے پوچھنے لگا: ''قاری صاحب! وہ دراصل ایک بات کرنی تھی۔''

''جی کہو بیٹا....''

''میرے کالج کے دو دوستوں کو بھی قرآن مجید کی تفسیری کلاس میں داخلہ لینا ہے۔ کچھ راہنمائی فرما دیں۔''

''ہاں! تو کل انھیں بھی ساتھ لیتے آنا، اسی وقت پڑھ لیا کریں گے۔''

قاری صاحب نے اجازت دے دی۔ اسی دوران برہان نامی زخمی نوجوان بیدار ہو گیا۔ قاری صاحب تیزی سے اس کے پاس گئے، پھر کچھ دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد انھوں نے اظہر کو آواز دی، برہان واش روم جانا چاہتا تھا۔ اظہر اور قاری صاحب نے سہارا دے کر اُسے قاش روم تک پہنچایا تھا۔

''قاری صاحب! یہ کیسا مشن اور کیسی مہم تھی؟ کیا میں جان سکتا ہوں؟''

اظہر نے واش روم کے باہر برہان کا انتظار کرتے ہوئے قاری صاحب سے پوچھا تھا۔ وہ پہلے تو خاموش رہے، پھر کچھ لمحے ٹھہر کے بولے:

''مشنِ ختم نبوت۔۔''

اظہر چونکہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کبھی اس طرح کے موضوع پر اس نے کوئی گفتگو سنی ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس مشن کے بارے میں بھی زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ برہان واش روم سے فارغ ہوا تو کچھ دیر بعد وہ تینوں کمرے میں بیٹھے تھے۔ یہاں قاری بشیر صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے مشن کے بارے میں آگاہ کیا۔ اظہر کو اس بارے مزید جاننے کا شوق پیدا ہوا۔

اب روزانہ کی بنیاد پر قاری صاحب اظہر کو ختم نبوت کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات بتانا شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اظہر کے دو دوست عبداللہ اور ثقلین بھی اس کے ہم سبق ہو چکے تھے۔ برہان سے ان تینوں کی دوستی ہو چکی تھی۔ قاری بشیر صاحب کے کالج اور مدرسے والے تمام شاگرد اب ختم نبوت کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ وہ ایمان کے ڈاکوؤں سے بھی واقفیت حاصل کر چکے تھے۔

برہان اور اُس کے دیگر ساتھی اب پتا چلانا چاہ رہے تھے کہ حالی روڈ کی اس عبادت گاہ میں رات کے وقت لائی جانے والی خواتین اور بچے کون تھے؟ انھیں یہاں کس مقصد کے لیے لایا گیا تھا۔

ایک دن قاری صاحب کو اطلاع ملی کہ دور دراز کی ایک بستی سے کسی غریب آدمی نے تھانے میں درخواست دی ہے کہ اس کی نافرمان بیوی اور معصوم اولاد کو کچھ نامعلوم اور مشکوک لوگ پیسے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ کچھ مزید ذرائع سے خبر یہ بھی ملی تھی کہ ایسی تمام عورتیں اور بچے حالی روڈ والی عمارت میں لائے جاتے ہیں اور انھیں زبردستی عقیدہ تبدیل کروا کر دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے۔

یہ خبر جس نے بھی سنی، اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ انتظامیہ کوئی کارروائی کرنے پر تیار ہی نہ تھے۔ کوئی بھی سرکاری ادارہ اُن عناصر کو روکنے میں ناکام و نامراد تھا۔

مدرسے کا ایک طالب علم بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

''پولیس.... پولیس... اس نے اندر آتے ہی شور مچا دیا۔

اس سے پہلے کہ قاری صاحبان کچھ سمجھتے، پولیس کے باوردی جوانوں نے مدرسے پر ہلہ بول دیا۔ بھاری نفری اور درجنوں گاڑیوں نے مدرسے کی عمارت کو گھیرے میں لے لیا تھا، جیسے یہاں کوئی چور ڈاکو چھپے بیٹھے ہوں۔

''یہاں چھاپہ کیوں مارا...؟'' متہم صاحب نے سامنے آتے ہوئے ایک اہلکار سے دریافت کیا۔

''بتاتے ہیں...'' یہ کہتے ہوئے پولیس والے ایک ایک کمرے کی تلاشی لینے لگے۔

پھر دوسری منزل کے ایک کمرے سے انھوں نے برہان کو برآمد کر لیا۔ انھیں کہیں سے شک پڑ گیا تھا کہ برہان ہی وہ شخص ہے جو اس رات حالی روڈ پر زخمی ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دشمن حد سے زیادہ چالاک، بااثر اور خطرناک تھا۔

قاری بشیر صاحب اس وقت اپنی کلاس کو سبق پڑھا رہے تھے۔ ایک طالب علم نے باہر سے آکر ان کے کان میں کچھ کہا اور ساتھ ہی باہر چلا گیا۔ قاری صاحب کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پریشان سے ہو گئے۔ اُن کی پریشانی اپنے لیے نہیں، بلکہ اس لیے تھی کہ پولیس والے برہان کے ساتھ ساتھ مدرسے کے متہم صاحب کو بھی گرفتار کر چکے تھے۔

سامنے بیٹھے طلبا نے بڑی حیرت سے قاری صاحب کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویے دیکھے۔ وہ کچھ دیر کے لیے باہر گئے اور جب واپس کلاس میں پہنچے، تو ایک طالب علم نے ہمت کر کے پوچھ لیا:

''قاری صاحب! کیا مسئلہ ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

''متہم صاحب کو پولیس ناحق گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ برہان پر انھیں شک ہو گیا ہے۔ متہم صاحب پیچھے حالات کو سنبھالنے کا حکم دے گئے ہیں۔'' قاری صاحب نے طلبا کو بتایا۔

شام کو اظہر، عبداللہ اور ثقلین اپنے اسباق لینے کے لیے پہنچے تو انھوں نے قاری صاحب کو بے حد پریشان دیکھا۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کچھ نہیں کہتے ہوئے بات کو ٹال دی۔ لیکن اظہر اور اس کے دوستوں نے بے حد اصرار کیا، اس پر قاری صاحب کو سارا قصہ بتانا پڑا۔

''قاری صاحب! کیا ہم کسی معاملے میں آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

پہلے تو قاری صاحب خاموش رہے، پھر اچانک ان کے ذہن میں خیال آیا۔

''عزیز طلبا! مجھے اپنے کسی معاملے کی فکر نہیں ہے۔ ہمیں اپنے متہم صاحب کی رہائی کی فکر ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اگر کوئی مسئلہ اہم ہے تو وہ میرے نبی ﷺ کی ختم نبوت کا ہے۔ ہمیں اس بارے میں آپ کا تعاون چاہیے۔''

''قاری صاحب! آپ حکم کریں، ہمیں پوری بات سمجھائیں پلیز۔'' ثقلین اور اظہر بیک زبان بولے۔

''عزیز بچو! حالی روڈ پر واقعہ اس مسجد نما معبد کو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ کن لوگوں کی عبادت گاہ ہے۔ اس طبقے کو پاکستان کے قانون نے 1974ء میں غیر مسلم قرار دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود بیوروکریسی میں انہی کا سکہ چلتا ہے۔ برہان کچھ ثبوتوں کے لیے اسی عبادت خانے کی جاسوسی پر مامور تھا، جب اسے گولی لگی۔ مگر اصل قصوروار اور دین دشمن سرگرمیوں کو جاننے کے باوجود پولیس اسی گمراہ طبقے کا حکم مانتے ہوئے برہان اور متہم صاحب کو گرفتار کر چکی ہے۔''

قاری صاحب بتا رہے تھے۔

''اوہ۔۔! برا ہوا۔ خیر ہم جلد انھیں رہا کروالیں گے قاری صاحب!'' اظہر نے عزم کا اظہار کیا۔

''بچو! جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ حال ہی میں قومی اسمبلی سے پاس ہونے والے ایک بل

کے مطابق کوئی بھی دو نمبر یا جعلی گروہ اسلامی شعائر کو اپنے عبادت خانوں کی زینت نہیں بنا سکتا۔ مگر یہ لوگ بڑی ڈھٹائی سے اس قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ جب انتظامیہ کو شکایت درج کروائی جاتی ہے تو وہ ثبوت فراہم کرنے کی رٹ لگائے رکھتی ہے۔'' قاری صاحب نے بتایا۔

''پھر اس حوالے سے ہمیں کیا طریقہ اپنانا چاہیے؟'' ثقلین نے سوال کیا۔

''بچو! ہمیں کرنا یہ ہے کہ خفیہ طریقے سے ان کے معبد میں جانا ہے۔ انہیں ایسا محسوس ہو کہ کوئی عام راہ گیر ان کے ہاں نماز ادا کرنے آیا ہے۔ میرے خیال میں آپ تینوں میں سے کوئی ایک بندہ یہ کام کر سکتا ہے، لیکن ہمیں ساتھ کیمرہ چھپا کے لے جانا ہوگا، تاکہ اندر لکھی ہوئی عبارات کی تصاویر اُتاری جا سکیں۔'' قاری صاحب نے تفصیل بیان کی۔

''میں حاضر ہوں...''

''اور میں بھی حاضر ہوں۔'' ثقلین اور اظہر نے باری باری ہاتھ کھڑے کیے۔

''میں بھی اس کام میں آپ کے ساتھ ہوں ہوں قاری صاحب! لیکن قانونی طور پر یہ کام کیسا ہوگا؟'' عبداللہ نے ہاتھ کھڑا کیا۔

''بیٹا! کسی جگہ کی تصویر بنانے پر تو فی الحال قانون خاموش ہے، مگر مذہبی شعائر میں دو نمبری پر تو اب واضح قانون موجود ہے۔ اس پر عمل درآمد نہیں ہو رہا۔ ہم اسی قانون پر عمل درآمد کے لیے انتظامیہ کے ساتھ ثبوت تلاش کرنے میں تعاون کریں گے۔'' قاری صاحب نے سمجھایا۔

''ہم سمجھ گئے قاری صاحب! یہ بہت اچھی بات ہے۔'' تینوں نے بیک وقت کہا۔

''مگر اس کام میں خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تمھیں خوب سوچ سمجھ لینا چاہیے پہلے۔''

قاری صاحب کی بات پر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر باری باری ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر مشن ہر صورت مکمل کرنے کا عزم کر لیا۔ ختمِ نبوت کے تینوں دیوانوں کو اس عظیم مقصد کے لیے خود کو پیش کرنے پر قاری بشیر کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ انھوں نے بلند آواز میں الحمدللہ کہا۔

پھر قاری صاحب نے طلباء کو بتایا کہ اس کام میں جو بھی مشکلات آئیں، وہ ہمارے لیے اعزاز ہو گا۔ کل قیامت کے دن حضور نبی کریم ﷺ کا شفاعت کے بدلے یہ مشکلات کچھ بھی زیادہ نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ میں اپنے دونوں بچوں سمیت خود بھی اس مشن کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ اپنے پیارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کیلیے تو اپنی جان بھی قربان ہے۔

"بے شک.... بے شک۔" تینوں نے بیک زبان کہا اور کمرے میں ایک نعرہ تکبیر بلند ہوا۔

دراصل ان تینوں کے حلیے مدارس کے طلبا سے ذرا الگ تھے۔ وہ کالج کی یونیفارم میں ہی مدرسے پڑھنے آتے تھے۔ ایسے نوجوانوں کو دیکھ کر کوئی کم ہی شک کر سکتا تھا۔ اس لیے قاری صاحب نے ان کی خواہش پر الگ الگ کام تجویز کر دیے تھے۔

عبداللہ اور ثقلین کو مدرسے کے دیگر طلبا کے ساتھ مل کر تھانے کچہری اور دفاتر کے معاملات دیکھنے تھے۔ وہ فوراً اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ جب کہ اظہر اور قاری صاحب کو اگلے ہفتے اصل مشن پر روانہ ہونا تھا۔ اس لیے وہ دو دن چھٹی لے کر گھر آگیا تھا۔

....☆....

مومنہ اور اظہر کے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس بار جب اظہر گھر آیا، تو ماں نے بتایا کہ مومنہ اس کی ساری سرگرمیوں سے واقف ہو چکی ہے۔ وہ بہت خوش ہے کہ اظہر نے اس کے کہنے پر نا صرف قرآن مجید کی تفسیر پڑھنا شروع کر دی ہے بلکہ دینی امور میں اس کی دلچسپی سے بھی مومنہ جیسی نیک سیرت لڑکی کو بڑی راحت پہنچی تھی۔

اسی لیے اب وہ خود بھی اظہر کو دل سے چاہنے لگی تھی۔ اسے اظہر کے بارے میں سوچنا اور اسی کو یاد کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔

''اظہر اس وقت کیا کر رہا ہو گا؟''

''وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا؟''

''اُسے کون سا لباس پسند ہو گا؟'' اسی طرح کی سوچیں دل میں بسائے مومنہ ایک ایک دن گنتی جا رہی تھی۔

اِدھر اظہر بھی دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ وہ آنے والے وقت کا سوچ کر نہال ہوا جاتا تھا۔ بڑی عید کے فوری بعد گھر والوں نے ان کی شادی کا ارادہ کر رکھا۔ یعنی اب اس حسین بندھن کو مکمل ہونے میں صرف ڈیڑھ ماہ باقی رہ گیا تھا۔

''مومنہ کتنی اچھی لڑکی ہے کہ جس کی وجہ سے مجھے اللہ کی پہچان نصیب ہوئی۔''

''مومنہ کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''وہ بھی مجھے چاہتی ہے یا نہیں؟''

اظہر ہر وقت انہی سوچوں میں رہنے لگا تھا۔ دو دن گھر میں چھٹی گزارنے کے بعد وہ واپس ہاسٹل جانے کے لیے تیار تھا۔ اس بار وہ اپنے ماں باپ کو جس انداز میں ملا تھا یوں لگتا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہو۔ رات کو وہ نمبر دار صاحب کے ڈیرے سے بھی ہو آیا۔ نمبر دار صاحب نے اسے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا تھا۔

''پتر اظہر! یاد رکھنا، تو ہی ہمارے گاؤں کا نام روشن کر سکتا ہے۔''

اُن کے اس جملے پر وہ سر ہلاتا ہوا مسکرا دیا تھا۔

ساری رات کروٹیں بدلتے گزری تھی۔ کبھی اس کی نظروں کے سامنے مومنہ کا معصوم سا چہرہ آجاتا، کبھی وہ ماں باپ اور کبھی گاؤں والوں کے چہرے اسے پرانی یادوں میں لے جاتے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ جلدی سے تیاری کر کے ماں باپ کی دعائیں لیتا ہوا وہ شہر کو روانہ ہو گیا تھا۔

گھر کی دہلیز پار کرتے وقت اسے کئی طرح کے وساوس نے گھیرا تھا۔ مگر وہ تو شروع سے ہی بہادر باپ کی بہادر اولاد تھا، چناں چہ اس نے تمام خیالات کو جھٹک دیا اور اپنی منزل کی جانب بڑھتے ہوئے زیر لب دعائیں پڑھنے لگا۔

....☆....

''تھانیدار صاحب! جو بھی ہو، ہمیں اس بندے کا مکمل اتا پتا چاہیے۔''

عبداللہ کے والد نے تھانے دار سے کہا، تو اس نے رجسٹرار کو آواز دی، رجسٹرار فائلوں کا پلندہ لیے حاضر ہوا، پھر کچھ ہی دیر بعد مطلوبہ آدمی کی درخواست اور اس کا مکمل بائیوڈیٹا مل چکا تھا۔

دراصل اظہر کے دوست عبداللہ کے والد ایک سرکاری آفیسر تھے۔ شہر بھر میں کئی جگہ ان کے تعلقات تھے۔

طے پایا کہ عبداللہ اپنے والد کے ذریعے تھانیدار سے ایک ضروری درخواست کی کاپی نکلوائے گا۔ یہ کام اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چناں چہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اپنے والد کے ہمراہ مطلوبہ تھانے سے درخواست کی کاپی نکلوا چکا تھا۔

یہ درخواست ایک دور دراز کے گاؤں میں رہنے والے حبیب اللہ کی طرف سے درج کروائی گئی تھی۔ جس کے بیوی بچوں کو نامعلوم مشکوک افراد ورغلا کر کہیں لے گئے تھے۔ عبداللہ اور ثقلین نے مل کر حبیب اللہ سے رابطہ کیا، وہ اسے انصاف دلانے کی یقین دہانی پر مدرسے میں لے آئے تھے۔ بے چارا حبیب اللہ پہلے ہی خوف زدہ تھا، مگر انصاف کی ہلکی سی کرن دیکھتے ہوئے ان کیساتھ مدرسے تک چلا آیا تھا۔ جہاں قاری بشیر اپنے ہونہار شاگرد اظہر رفیق کے ساتھ مل کر ڈپٹی کمشنر کے لیے ایک درخواست لکھ چکے تھے۔

''حبیب اللہ! تمھیں کس پر شک ہے، یعنی کون تمھارے بیوی بچوں کو اغوا کر سکتا ہے؟''

قاری صاحب نے پوچھا۔

''جی مولوی صیب! وہ لوگ نہ جانے کہاں سے آئے تھے۔ ہمیں فری میں راشن اور کپڑے دیا کرتے تھے۔''

وہ گویا ہوا، پھر کچھ توقف سے بولا:

''وہ ہمارے ساتھ مالی تعاون کرتے تھے۔ میری بیوی ان کی سخاوت اور دولت سے کافی متاثر تھی۔ گھر میں مالی پریشانی کی وجہ سے ہماری اکثر لڑائی رہتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ کبھی کبھار گھر سے چلے جانے کی دھمکیاں بھی دیتی تھی۔ میں نے کبھی ان دھمکیوں کو سیریس نہیں لیا تھا، مگر ایک دن وہ سچ مچ...''

اتنا کہتے ہوئے حبیب اللہ اپنے بچوں کو یاد کرتے ہوئے آنسو بہانے لگا۔

قاری صاحب نے اسے حوصلہ اور تسلی دی۔ پھر اظہر اور حبیب اللہ کو اپنے ساتھ لے کر ڈپٹی کمشنر آفس جا پہنچے۔ انھوں نے اپنے تئیں ایک بڑا ثبوت ساتھ لے لیا تھا۔ مگر ہر سرکاری دفتر میں چکر پہ چکر لگانے کے باوجود کوئی بھی آفیسر قانون کی عمل داری کے لیے تیار نہ تھا۔آخر انھوں نے سوچ بچار کر کے ایک اہم فیصلہ کیا اور واپس مدرسے آگئے۔

....☆....

ثقلین کو پہلی کامیابی مل چکی تھی۔اس وقت وہ معبد کے اندر موجود تھا۔اس نے کسی کو شک نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کے پاس کیمرا بھی ہے، عبداللہ باہر ایک چھوٹی گلی میں کھڑا اس انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہر آتے جاتے شخص پر بغور نگاہ جمائے ہوئے تھا۔اتنے میں ثقلین معبد سے باہر نکلا۔ کیمرا اس کی واسکٹ کی جیب میں تھا۔

باہر نکلتے ہوئے ایک گارڈ کی اس پر نگاہ پڑ گئی، اس سے پہلے کہ وہ ثقلین کی تلاشی لیتا، اس نے دوڑ لگا دی تھی۔ دوڑتے ہوئے وہ ساتھ والی گلی میں مڑا جہاں عبداللہ کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

''بھاگو عبداللہ بھائی، جلدی بھاگو...''

اس نے بلند آواز میں کہا اور کیمرا اس کی طرف اچھال دیا، عبداللہ نے کیمرا جھپٹا اور آناً فاناً یہ جا وہ جا.... دو تین گھنٹے کی مشقت کے بعد تھکاوٹ کی وجہ سے ثقلین کا برا حال تھا۔اس سے پہلے کہ وہ بھی تیز بھاگتا، گارڈ نے اسے آن دبوچا تھا۔ ثقلین نے ہانپتے ہوئے اس سے زور آزمائی شروع کر دی۔ اس سے پہلے کہ لڑائی بڑھتی، کچھ راہ گیروں نے مداخلت کر کے ثقلین کی گارڈ سے جان چھڑائی، تو وہ موقع پا کر وہاں سے فرار ہو گیا۔

اِدھر عبداللہ نے مدرسے پہنچ کر کیمرا قاری صاحب کے حوالے کر دیا تھا، اجس میں تصویروں کے نیگٹو موجود تھے۔اس کے پیچھے ہی ثقلین بھی آگیا۔ یہ دراصل عبادت گاہ کے اندر لگی اسلامی آیات اور اسلامی شعائر کی تصاویر تھیں۔ اب اس عمارت کی پُراسراریت کچھ کم ہونے لگی تھی۔ سبھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں کیا کچھ لکھا گیا ہے اور یہاں کس قسم کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔

''الحمدللہ! ہمارے پاس اب ایک سے زیادہ ثبوت جمع ہو چکے ہیں۔''

قاری بشیر نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بتایا۔

''گویا حالی روڈ کی پُراسرار عمارت کے بارے اب ہم جلد کوئی فیصلہ لیں گے؟''

ایک طالب علم نے پوچھا تو قاری صاحب نے سر ہلا دیا۔

مگر اس کے باوجود شہر کی انتظامیہ ان کے ساتھ باقی مذہبی تنظیموں کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس ڈھٹائی پر مذہبی حلقوں میں شدید تشویش کی لہر دوڑ گئی، کیوں کہ اسلام کے نام پر ایک جعلی عبادت گاہ کو مسجد کا نام دینا اور وہاں مسلمانوں والے کام کر کے سادہ لوح مسلمانوں کے گمراہی کی دلدل میں دھکیلنا کسی کو بھی قبول نہ تھا۔

....☆....

اگلے دن شام کے وقت اظہر قاری صاحب کے پاس پہنچا تو وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

انھیں مصروف دیکھ کر اظہر نے پوچھا:

''قاری صاحب! لگتا کہیں سفر کا ارادہ رکھتے ہیں آپ!''

''بالکل! تم نے درست جانا بیٹا...!''

''کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ کہاں جانے کی تیاری ہے؟''

''بیٹا! یہ اہم مشن ہے، خیر تم چھوڑو، یہ بتاؤ کہ آج عبداللہ اور ثقلین کیوں نہیں آئے؟''

''چھٹی پر ہیں وہ دونوں.....اور حبیب اللہ کا کیا بنا قاری صاحب؟''

''وہ بھی میرے ساتھ جا رہا ہے۔ آج کی شام حالی روڈ کے نام ہو گی۔'' قاری صاحب نے مسکرا کر کہا تو اظہر حیران رہ گیا۔

''پھر تو مجھے بھی اس کام میں آپ کے ہمراہ ہونا چاہیے قاری صاحب!''

اظہر نے کہا تو قاری صاحب اس کے پاس آ گئے، کچھ توقف کر کے انھوں نے بتایا کہ ہمیں اب مکمل یقین ہے کہ حبیب اللہ کے بیوی بچوں کو اسی پُراسرار عمارت میں رکھا گیا ہے، مگر وہاں جانا اب

خطرے سے خالی نہیں ہے، میں اور حبیب اللہ جائیں گے، ممکن ہے وہاں پوری رات لگ جائے، تمھارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔

''مگر قاری صاحب! مجھے آپ کے ساتھ وہاں لازمی جانا ہے۔ یہ کوئی عام نہیں، بلکہ ختم نبوت کا یہ اہم اور مقدس مشن ہے، کوئی بھی مشکل آئے تو میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔'' اظہر کی خواہش پر قاری صاحب خاموش ہو گئے۔

آخر انھیں ہار ماننا پڑی۔ اس ٹیم میں کل پانچ لوگ شامل تھے۔ قاری صاحب، اُن کا تیرہ سالہ بیٹا سعید، بیس سالہ اظہر رفیق، مدرسے کا ایک طالب علم جنید اور وہ متاثرہ شخص حبیب اللہ...

رات کے پہلے پہر میں حالی روڈ سے ملحقہ ایک چھوٹی گلی میں انھوں نے اپنا ٹھکانہ بنایا تھا۔ مگر یہ تمام لوگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔ آج ان کے پاس دو اہم کام تھے۔ حبیب اللہ کے گھر والوں کو پتا چلانا اور عبادت کی دیواروں پر موجود اسلامی شعائر حذف کرنا، تاکہ کوئی عام اور انجان مسلمان ان کے دھوکے میں آکر یہاں پھنس نہ جائے۔

''قاری صاحب! شاید انھیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ انھوں نے ہماری ریکی شروع کر دی ہے۔''

اظہر نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''شاید نہیں بلکہ یقیناً ایسا ہی ہے۔''

قاری صاحب نے مختصر جواب دیا اور حالات کو بھانپتے ہوئے جنید اور حبیب اللہ کو عمارت کے عقب سے آنے کا حکم سنا دیا۔

مین سڑک پر کبھی کبھار ہوٹر بجاتی پولیس کی گاڑی بھی چکر لگا لیتی اور کبھی کوئی پہریدار سیٹی بجاتا وہاں سے گزر جاتا، قاری صاحب نے اللہ کا نام لیا اور عبادت گاہ کے چاروں اطراف میں موجود وسیع باغات کی چار دیواری کو پھلانگنے کی تیاری کر لی۔

انھوں نے اظہر کی مدد سے دیوار کی ایک درز میں پاؤں رکھا اور اوپر چڑھ گئے، پھر انھوں نے اپنے بیٹے سعید کا ہاتھ تھاما اور اسے اوپر کھینچ لیا، اس کے بعد انھوں نے اظہر کو اوپر چڑھنے میں مدد

فراہم کی۔ انھیں اس بات کی حیرت تھی کہ اس قدر سخت ریکی کے باوجود انھیں کسی نے دیکھا تک نہیں تھا، بلکہ وہ آرام سے دیوار پھلانگ کر دوسری طرف آچکے تھے۔

''قاری صاحب! کیا پتا یہ کوئی چال ہو ان کی۔''

اظہر نے کہا، تو قاری صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ابو جی! مجھے اپنے کندھوں پر بٹھالیں۔ میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔''

ننھے سعید نے کہا تو قاری صاحب نے جھک کر اسے کندھے پر سوار کر لیا۔

قاری صاحب نے بلند آواز میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک بھیج کر ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ اس عبادت گاہ کو اسلامی طرزِ تعمیر اور یہاں لگے شعائر اسلامی دیکھ کر کئی مسافر مسلمان دھوکے سے یہاں نماز پڑھنے آجاتے تھے، حالانکہ قانوناً یہ لوگ مسلمان نہیں تھے۔ بس اسی دھوکا دہی کو ختم کرنے اور اللہ و اللہ کے رسول کا نام سربلند کرنے کے لیے قاری صاحب نے یہ اقدام اٹھایا تھا۔

ابھی انھوں نے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی قاری بشیر صاحب کی ٹانگ پر آن لگی۔ اس کے اس خاموش پہر فائرنگ کی آواز سے در و دیوار لرز اُٹھے تھے۔ خون کے فوارے بلند ہوئے۔ قاری صاحب، اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتے ہوئے زمین پر آگرے تھے۔

سعید بھی ان کے ساتھ ہی زمین پر تھا۔ ایک اور گولی قاری صاحب کے کندھے کو چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ پھر پے در پے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ باہر ایک شور بلند ہوا اور بھاگم دوڑی شروع ہو گئی۔

اظہر ایک طرف زخمی پڑا کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا۔ جب کہ دوسری طرف قاری سعید زمین پر گھسٹتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ گیٹ کا دروازہ کھولتے۔ مزید گولیاں ان کے جسم کو چھلنی کر گئی تھیں، مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ مین گیٹ کا دروازہ کھول کر قاری صاحب باہر نکلے اور باآواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔

''ابو جی.... ابو جی.... آپ کو کیا ہو گیا ابو جی...!''

ننھا سعید روتا دھوتا بھاگ کر اپنے ابا کو اٹھانے لگا مگر شاید اب اللہ سے ملاقات کا وقت آن پہنچا تھا۔ قاری صاحب نے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اپنے پیارے بیٹے کی گود میں جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی تھی۔

گولیوں کی آواز سنتے ہی، کچھ پہریدار، پولیس اہلکار اور قریبی لوگ اس طرف کو بھاگے تھے۔ مین گیٹ کو کھلا دیکھ انھوں نے تیزی سے اس طرف کا رخ کیا۔ آگے کا منظر دیکھ کر ان کا کلیجا منہ کو آگیا تھا۔

پولیس والوں نے سعید کو ایک طرف کر کے لاش اپنے قبضے میں لی اور جلدی سے وائرلیس پر تازہ نفری طلب کر لی تھی۔ تھانہ قریب ہی تھا۔ چناں چہ اگلے دس منٹ میں پوری عمارت کا گھیراؤ ہو چکا تھا۔ حبیب اللہ اور جنید بھی ہانپتے کانپتے اِدھر پہنچ چکے تھے۔ یہاں کا منظر دیکھ کر تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ رات کے اس پہر بھرپور ہجوم حالی روڈ پر جمع ہو چکا تھا۔

پولیس نے ملزموں کو گرفتار کرنا چاہا تو آگے سے سیدھے فائر پولیس اہلکاروں پر کھول دیے گئے۔ گھبرا کر پولیس اہلکار بھی عمارت کی وسیع چار دیواری سے باہر نکل آئے۔ مگر اس سارے قضیے میں کسی کو یاد تک نہ رہا کہ اظہر کہاں ہے؟ نئی نفری کے آنے پر پولیس نے اظہر کو ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے خون کے دھبوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

شک گزرا کہ قاتل اس کی لاش کو کسی خفیہ راستے سے باہر لے گئے ہیں۔ پھر بھی پولیس کی جانب سے اظہر کی تلاش جاری رہی، مگر اسے ملنا تھا اور نہ ہی وہ ملا۔ ننھے سعید کے کپڑے اپنے والد کے خون سے سرخ ہو چکے تھے۔ وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اتنے میں قاری صاحب کے مدرسے میں اطلاع دی گئی تو وہاں سے بھی بھاری تعداد میں اساتذہ اور طلباء رات کے اس پہر حالی روڈ پر پہنچ گئے تھے۔

صبح اس حادثے پر پورے شہر میں ہنگم بپا تھا۔ شہر میں مکمل طور پر ہڑتال تھی۔ لوگ غصے میں تھے۔ وہ پُرجوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس نکال رہے تھے۔ سب سے بڑا جلوس اظہر کے ٹیکنالوجی کالج کا تھا۔ جن کا مطالبہ تھا کہ اظہر کو زندہ یا مردہ کہیں بھی تلاش کیا جائے۔

حالات زیادہ خراب ہوئے تو فوج طلب کر لی گئی۔ لوگ اس نام نہاد عبادت گاہ کو نذر آتش کرنے کی تیاریوں میں تھے۔ مگر پولیس نے تھانے میں بند مدرسے کے متہم صاحب کی منت سماجت کی۔ انھیں رہا کر کے وقوعہ پر پہنچایا گیا۔

مدرسے کے متہم صاحب نے اس اندوہ ناک واقعہ پر اناللہ وناالیہ راجعون پڑھا اور پورے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب ادارے اپنا کام ایمانداری سے نہیں کرتے، تو عوام کو پھر خود ہی اپنے مطالبات کے لیے سڑکوں پر نکلنا پڑتا ہے۔ متہم صاحب نے ننھے سعید کو گلے لگایا، اس کا ماتھا چوما اور مجمع سے خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ ہم قانون کو ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ مگر ہماری بات سنی جائے۔

شام کو شہر کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تیار تھا۔ ایک شہید کا جنازہ... بلکہ شہیدِ ختم نبوت جنھوں نے لوگوں کے ایمان کے تحفظ کے لیے اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیا تھا۔ جنازے کے بعد احتجاج کا سلسلہ گلی گلی محلے محلے پھیل چکا تھا۔ مظاہرین کا مطالبہ قاتلوں کو سزا دلانے اور اظہر رفیق کی تلاش پر مبنی تھا۔

....☆....

بھائی رفیق اپنی اہلیہ کے ہمراہ اس کی بہن کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی ہونے والی بہو مومنہ کے لیے ڈھیر سے کپڑے اور کچھ مزید تحائف بھی خرید لیے تھے۔ اُدھر مومنہ نے آج خالہ اور خالو جان کے استقبال کے لیے طرح طرح کے کھانے بنا رکھے تھے۔ جیسے ہی مہمانوں کی آمد ہوئی۔ گھر خوشیوں سے مہک اٹھا تھا۔ خالہ نے آگے بڑھ کر مومنہ کو پیار دیا اور اس کا ماتھا چوما۔ پھر نماز کے بعد وہ سبھی کھانے کی تیاری کرنے لگے۔

"باجی! میں تو کہتی ہوں کہ اظہر اور مومنہ کی جوڑی واقعی بہت خوبصورت ہے اللہ نظر بد سے بچائے۔"

مومنہ کی ماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"آمین.... بس میں تو چاہتی ہوں کہ اب جلدی سے ان کی شادی ہو جائے۔ ویسے بھی دن

کتنے رہ گئے، انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں۔"

اظہر کی ماں نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا، ساتھ ہی اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ مومنہ سے نسبت طے ہونے کے بعد ہم نے اظہر میں بہت سی مثبت تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ وہ ماشاءاللہ پہلے سے بھی بڑھ کر ہمارا فرمانبردار بن گیا ہے۔ اس بندھن سے وہ بہت خوش ہے۔

مومنہ نے یہ بات سنی تو دوپٹا اپنے ہونٹوں میں دبا کر شرماتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔

دل ہی دل میں اس نے نہ جانے کتنی بار اظہر سے اظہار محبت کر دیا تھا۔ واقعی اس نسبت کے بعد تو مومنہ میں بھی اچھی خاصی تبدیلی دیکھنے میں آئی تھی۔ وہ بات بات پہ شرما جاتی تھی۔

"باجی! میں تو کہتی ہوں کہ آج آپ رُک جائیں، مت جائیں واپس۔"

مومنہ کی ماں عظمیٰ نے اپنی بڑی بہن سے کہا۔

"ناں بھئی! گھر میں کام کرنے والے بہت پڑے ہیں۔ پھر کبھی چکر لگا لیں گے، بس اب چلتے ہیں ہم۔

رضیہ نے عظمیٰ کی پیش کش رد کرتے ہوئے کہا۔ اب وہ واپسی کی تیاری میں تھے۔ مومنہ نے اپنی خالہ کو گلے ملتے ہوئے چپکے سے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھما دیا تھا۔ یہ کام کرتے ہوئے وہ اچھی خاصی شرما گئی تھی۔ خالہ نے اپنی پیاری بھانجی کا چہرہ دیکھا اور ساری بات سمجھ گئیں۔

"بے فکر رہو بیٹی...! یہ پہنچ جائے گا اظہر تک۔"

خالہ نے ہنستے ہوئے اُسے یقین دہانی کروائی تو وہ شرما کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اس نے بڑے چاؤ سے اظہر کے لیے مٹھائی تیار کی تھی، ساتھ میں ایک عدد رومال اور ٹوپی، تسبیح اور گلاب کے چند پھول اس ڈبے میں پڑے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ رضیہ کے واپس آتے ہی گھر میں دوبارہ سے رُکے ہوئے کام شروع ہو چکے تھے، شادی کی تیاریوں میں دن رات ایک ہو چکا تھا۔ مہمانوں کی فہرستیں تک بن چکی تھیں۔

....☆....

دیوار کے ساتھ اظہر رفیق نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ اُس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

اچانک اسے اپنے کانوں میں بوٹوں کی آواز سنائی دی، پھر کچھ کھسر پھسر سے وہ چونک اُٹھا:

''بڑا مولوی تو ٹھکانے لگ گیا ہے۔'' ایک آواز آئی۔

''اس لڑکے کو یہاں سے اُٹھا کر تہہ خانے میں پہنچادو۔''

دوسری آواز آئی تو اس کے ساتھ کچھ لوگوں نے اظہر کو ہاتھوں اور پاؤں سے پکڑا اور اسے نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔ یہ کوئی اندھیر نگری تھی شاید، جہاں ہلکی سی لالٹین کے سوا کوئی دوسری روشنی نہ تھی۔ اُسے یہاں لانے والوں کے چہرے زیادہ واضح نہیں تھے۔ مگر وہ بے حد خوفناک باتیں کر رہے تھے۔

''یہ لڑکا زندہ ہے۔ اسے اپنے مقاصد کے لیے زندہ رکھنا ہے۔'' ایک کرخت آواز گونجی تھی۔

اظہر کو اس تکلیف میں بھی قاری صاحب کی فکر ہو رہی تھی۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہو۔ وہ خود بھی تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ زیادہ خون بہ جانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ ایک اور دنیا میں قدم رکھتا گیا۔

بے ہوش پڑے اظہر کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ پھر اسی حالت میں اس پر بدترین تشدد شروع ہو گیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھ کھلتی تو زبان پر اللہ اللہ جاری ہوتا۔ رات کن کٹھن مرحلوں میں گزری یہ اللہ اور اس کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے اظہر کے چہرے پر پانی کا مگ پھینکا اور اسے رسیوں سے باندھ کر چھت سے اُلٹا لٹکا دیا۔

''بتاؤ تمھیں یہاں کس نے بھیجا اور کس کام سے تم لوگ آئے تھے... بتاؤ۔''

کرخت آواز اس کے کانوں کو چیر رہی تھی، مگر داد ہے اظہر کی ہمت اور حوصلے کو، اس نے اپنی زبان نہیں کھولی۔

تشدد کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ اظہر نے زندگی میں کئی سختیاں دیکھ رکھی تھیں، مگر وہ سختیاں اب اسے اس تشدد کے سامنے بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ برداشت کی حد ختم ہونے کے بعد گاہے اس کا دل کرتا کہ وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے، مگر پھر قاری بشیر کے الفاظ اس کے

کانوں میں گونجتے، وہ ختم نبوت اور تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کے اس مقدس مشن پر ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار تھا۔

''کون ہو تم...؟ کیا نام ہے تمھارا؟ اور اس مولوی کے کیا لگتے ہو تم؟''

ایک اور غنڈہ ٹائپ آدمی نے اظہر کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

جواب میں اظہر نے پہلی بار زبان کھولی تھی:

''اللہ کا بندہ ہوں اور اپنے پیارے حبیب ﷺ کا ادنیٰ سا غلام اور ختمِ نبوت کے دشمنوں کے لیے قہر ہوں۔''

یہ سنتے ہی تشدد کی ایک نئی لہر شروع ہو گئی تھی۔ جواب میں تہہ خانہ اللہ... اللہ اکبر کے نعروں سے گونجتا، یوں لگتا کہ کفر و شرک کے اس عقوبت خانے میں سنتِ بلال زندہ ہو رہی ہو۔

....☆....

شہر کے حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ مظاہرین آئے روز سڑکیں بلاک کر کے اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہے تھے۔ ملک میں فوجی حکومت تھی۔ کچھ دن قبل ہونے والا معاملہ مذہبی تنظیموں کے پریشر کی وجہ سے اعلیٰ حکام تک پہنچ چکا تھا۔ پولیس اپنا کام بڑی پھرتی سے کر رہی تھی۔ ایک طرف اظہر کی تلاش جاری تھی۔ دوسری طرف قاتلوں کے سراغ لگایا جا رہا تھا۔

''فیروز! بھاگو.... جلدی کرو! پولیس کو ٹھکانے کا علم ہو گیا ہے۔ ہمارے ہی بندے سے اندر سے خبر دی ہے۔''

ایک دبلا پتلا آدمی تہہ خانے میں داخل ہوتے ہی چلایا تھا۔ اظہر کے قریب بیٹھا فیروز نامی بھاری بھر کم آدمی چونک اٹھا تھا۔

'' ابھی کچھ دیر میں یہاں پولیس چھاپہ مارنے والی ہے۔ اس لونڈے کا ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔'' دوبارہ وہی آدمی بولا تھا۔

''اسے باہر لے کے نہیں جا سکتے، ورنہ پکڑے جائیں گے۔''

فیروز نے غصے سے گلا پھاڑ کر کہا۔

پھر آناً فاناً وہ اظہر کی طرف لپکا اور جیب سے چاقو نکال اس کی رسی کاٹ دی۔ دھڑام سے اظہر کا وجود زمین پر گرا تھا۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتا، ایک خنجر اس کے پیٹ میں پیوست ہو چکا تھا۔

اظہر نے حیرت سے خنجر مارنے والے کو دیکھا، یہ فیروز ہی تھا، پاس ہی اس کا ساتھی اور تہہ خانے کا چوکیدار کاشف کھڑے تھے۔ اظہر کی سانس اُکھڑنا شروع ہوئی تو اس نے کلمہ شہادت کا ورد شروع کر دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

گیدڑوں کی طرح چھپتے چھپاتے اور بھاگتے ہوئے فیروز کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے، اس نے جاتے جاتے اظہر کی پیشانی اور چہرے کو گولیوں سے چھلنی کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش کی تھی۔

دو گھنٹوں بعد پولیس اس تہہ خانے تک پہنچ چکی تھی، جہاں اب اظہر کی لاش کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ لاش کا ملنا تھا کہ ایک بار پھر پورے شہر میں شٹر ڈاؤن ہڑتال شروع ہو گئی، بڑے چوک میں میت کو رکھ کر مدارس اور اسکول کے طلبا اور تاجروں نے احتجاج شروع کر دیا تھا۔ لوگوں کے احتجاج اور پریشر پر اسلام دشمن قوتوں کے خلاف گھیرا تنگ کرنے کا آغاز ہوا۔ انتظامیہ نے اعلیٰ حکام سے ہدایات لے کر جگہ جگہ چھاپے مارنے کا کام جاری رکھا تھا۔

آخر تین دن کی سر توڑ محنت کے بعد چار لوگ گرفتار ہو چکے تھے۔ یہ نا صرف مرتد تھے، بلکہ قاتل اور بدمعاش بھی تھے۔ بڑی مشکل سے پولیس نے انھیں بچا بچا کر اکر تھانے پہنچایا، پھر وہاں سے انھیں جیل منتقل کر دیا گیا۔

لوگوں کا غصہ دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ان بدمعاشوں کو زندہ جلا دیں گے۔ صوبائی اور وفاقی حکومتیں اس سارے معاملے کو باریک بینی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان قاتلوں کے خلاف عوامی مطالبہ تھا کہ انھیں فوجی عدالتوں میں سزائیں سنائی جائیں۔ اس مطالبے پر عمل ہوا۔ ان کا کیس فوجی عدالت ہی میں لگایا گیا تھا۔

....☆....

شہید اظہر رفیق کی میت علاقے میں پہنچی تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ شہادت کا سن کر مومنہ کے والدین پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اظہر کے دوست یار اور گاؤں کے دیگر لوگ اس کے گھر جمع ہو چکے تھے۔ نمبر دار صاحب لاٹھی ٹیکتے ہوئے نمناک آنکھوں سے قدم قدم آگے بڑھتے رفیق کے پاس پہنچے تھے۔ ہر آنکھ اس جوانِ رعنا کی شہادت پہ اشک بار تھی۔

دوسری طرف مومنہ تو یہ خبر سنتے ہی سکتے کی کیفیت میں جا چکی تھی۔ عظیم مقدس کے لیے اظہر کی شہادت پر اسے فخر بھی تھا، مگر وصل سے پہلے ہی ہجر کی صعوبتوں سے جو انسان دوچار ہو جائے، اس کا غم پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔ گم سم سی فضا میں مساجد کے اندر اعلانات گونج رہے تھے:

''حضرات! بھائی رفیق کے بیٹے اظہر رفیق شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے ہیں۔ نماز جنازہ مغرب کی نماز کے بعد ادا کی جائے گی۔''

گاؤں میں کوئی رش تھا؟ یوں لگتا کہ پورا شہر یہاں امڈ آیا ہے۔ اس جواں ہمت شہید کا جنازہ ایسا روح پرور منظر تھا کہ بڑے بڑے نامی گرامی رشک کرنے پر مجبور تھے۔ آقائے ﷺ کی حرمت و ناموس پر اپنی جان قربان کر دینے والے اس بچے کو دنیا خراجِ عقیدت پیش کر رہی تھی۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کر جنازے پر پھول پھینک رہے تھے۔

اظہر کے کالج کے تمام دوست اس وقت یہاں موجود تھے۔ عبداللہ اور ثقلین بھی آنکھوں میں آنسو لیے اظہر کو یاد کر رہے تھے، اس کی رشک آمیز موت اور پُر شکوہ جنازے پر ہر کوئی حیران تھا۔ اللہ نے اس نوجوان کو جس مقصد کے لیے قبول کیا تھا وہ بہت بڑا تھا۔

شاید اسی لیے اظہر کے والدین اللہ سے شکوہ کناں ہونے کے بجائے اس کی بارگاہ میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ سجدہ شکر ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف اس وقت کے حکمران صدر جنرل ضیاءالحق کی خصوصی نگرانی کے بعد یہ کیس بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھا۔ فوجی عدالتوں نے چاروں قاتلوں کو سزائے موت سنائی اور ساتھ ہی متنازعہ عبادت گاہ کو ہمیشہ کے لیے سیل کر دیا گیا۔

یعنی قاری بشیر احمد شہید اور اظہر رفیق شہید کے خون سے انقلاب آچکا تھا۔ ایسا انقلاب کہ جو کبھی کسی نے سوچا تک نہیں تھا۔ جان کی بازی لگانے والے اللہ کے یہ شیر پورے شہر بلکہ پورے ملک کے لیے ہیرو بن چکے تھے۔ علاقے بھر میں ختم نبوت کے نغمے پڑھے اور سنائے گئے۔ جب کہ شہدا کے قاتل اپنے انجام جو پہنچنے جا رہے تھے۔

عوام کے شدید مطالبے پر شہری انتظامیہ نے ان کی شہدا کی یاد میں ایک تعزیتی سرکاری تعزیتی ریفرنس منعقد کیا۔ شہدا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شہر کے سب سے بڑے چوک کو شہدائے ختم نبوت کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ آج بھی ساہیوال کا یہ چوک انہی شہدا کی یاد دلاتا ہے۔

☆...☆...☆